ڈاکٹر عبادت بریلوی
پرنسپل اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی

صنفِ غزل کے بنیادی اُصول

غزل کی ایک عام سی تعریف، تو یہ ہے کہ وہ عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنے کا نام ہے۔ یہ تعریف یوں تو اپنی جگہ پر صحیح ہے اور اس سے کسی حد تک غزل کے مزاج کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس کی اصل روح سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ اگر غزل کا مطلب صرف عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنا ہے تو شاید دبستانِ لکھنؤ کے وہ شعرا غزل کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جائیں گے جنھوں نے عورت اور اس سے متعلق کسی پہلو کو بھی چھوڑا نہیں ہے بلکہ جن کی شاعری میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جس کو عملی طور پر کرتے تو سب ہیں لیکن جس کے متعلق بات چیت اور گفتگو کو معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن دبستانِ لکھنؤ کے ان شاعروں نے جن غزلوں کی تخلیق کی ہے، ان میں اس صنف کا صحیح مزاج نہیں ہے۔ اس کی اصل روح ان میں نظر نہیں آتی۔ ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزلیں لکھ کر شاعری سے زیادہ پہلوانی کی ہے۔ ان کے یہاں غزل کے مزاج سے زیادہ پٹے بازی کا مزاج ملتا ہے اور ان کے بعد تو لکھنوی شاعروں کے یہاں غزل کا مزاج نام کو بھی باقی نہیں رہا ہے۔ بس پٹے بازی ہی پٹے بازی رہ گئی ہے۔ آتش کے یہاں بے شک غزل کا مزاج کہیں کہیں ملتا ہے لیکن ان کی غزلوں میں بھی پٹے بازی کی مثالیں جگہ جگہ نظر آجاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ لکھنؤ کے اس ماحول کا نتیجہ ہے جس کے سائے میں ان شاعروں کی نشو و نما ہوئی۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ اس تعریف کو غزل کا معیار اور اس کے مزاج کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

غزل اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے کسی قدیم ایرانی نے غزل کی تعریف یہ کی ہے کہ غزل کا تعلق اصل میں غزال سے ہے۔ غزال کو جب شکاری شکار کرنے کی غرض سے تیر مارتے ہیں اور غزال زخمی ہو کر بھاگتا ہے تو اس عالم میں اس کے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔ وہ چوکڑی بھرتا ہے

لیکن شکاری اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زخم کی تکلیف سے بے دم ہوکر گر جاتا ہے۔ شکاری اس کے قریب پہنچتے ہیں۔ اس وقت غزال کی آنکھوں میں جو حسرت ہوتی ہے اس کا نام غزل ہے۔ یہ تعریف غزل کے مزاج کو بڑی حد تک واضح کر دیتی ہے۔ درحقیقت اس میں غزال کا تیر کھانا، تیر کھا کر زخمی ہونا، زخمی ہوکر گرنا، گر کر تڑپنا، تڑپ کر جان دے دینا اور جان دینے کے عالم میں نہ جانے کیا کیا کچھ سوچنا، ان سب باتوں میں درد و کرب، مایوسی و ناکامی اور حزن و یاس کی جو ملی جلی کیفیات ہیں، ان کا تعلق غزل اور اس کے مزاج سے ہے۔ اور غزال کی مثال دے کر غزل کی یہ تعریف کرنے والا درحقیقت اسی صورت حال کو واضح کرنا چاہتا ہے۔

یہ تعریف غزل کی بڑی ہی پہلو دار تعریف ہے۔ اس کی بنیاد انسانی زندگی کے وہ بنیادی حقائق ہیں جو غزل کے مزاج کی جان ہیں۔ اس میں بنیادی حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی غم کا نام ہے۔ اس میں درد ہی درد ہے۔ وہ شروع سے آخر تک حسرت ہی حسرت ہے۔ پھر اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زندگی کی محبت، اس کو بسر کرنے کی خواہش، اس کو برتنے کی تمنا۔ اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی آرزو اس حسرت کے خیال اور احساس کو زیادہ شدید کر دیتی ہے۔ زندگی میں شر کی قوتوں کا دَور دَورہ ہے۔ وہ خیر کی قوتوں کو پامال کرتی ہیں اور اس طرح زندگی میں جو کچھ انسان چاہتا ہے وہ اس کو نصیب نہیں ہوتا۔ وہ آس پاس گرد و پیش غم کے سائے دیکھتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال اسے زیادہ حساس اور جذباتی بنا دیتی ہے چھوٹی چیزیں بھی اس کے لیے بڑی بن جاتی ہیں۔ معمولی باتوں میں بھی وہ وسعتیں پیدا کر لیتا ہے لیکن اس تجربے کی نوعیت تمام تر داخلی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کا اظہار اشاروں اور کنایوں میں ہوتا ہے غزال کی آنکھ میں مرتے وقت جو حسرت ہے وہ کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ اس کے اشارے بڑے ہی بلیغ اور اس کے کنائے بڑے ہی معنی خیز ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت معنوی اور صوری اعتبار سے صنفِ غزل کی ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے بنیادی حقائق کو داخلی اور جذباتی انداز میں اشاروں اور کنایوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ باتیں اس کے مزاج میں داخل ہیں اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب غزل میں انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کی ترجمانی

ہوتی ہو تو پھر اس کے مزاج میں عشق کی کیا حیثیت ہوتی۔ کیا اس کی فضا عشقیہ معاملات کی ترجمانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؟ - غزل کی روایت سے دلچسپی رکھنے والے کے یہاں، غزل کے مزاج پر غور کرتے ہوئے ان سوالات کا پیدا ہونا لازمی ہے، کیونکہ غزل کی کئی سو سال کی روایت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس کا بنیادی موضوع ہر دور میں عشق ہی رہا ہے۔ غزل کے شاعر نے جذبۂ عشق کے ایسے ایسے اسرار و رموز بے نقاب کیے ہیں جن کی تہ تک عشق کے فلسفی کا بھی پہنچنا مشکل ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس انسانی جذبے کے مختلف پہلوؤں کی جیسی مصوری غزل میں ملتی ہے، اس کی مثال کسی اور صنفِ ادب میں نہیں مل سکتی۔ حالانکہ دنیا کے ہر ملک کے ادب میں عشقیہ معاملات کی ترجمانی کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور یہ ترجمانی مختلف اصناف شعر و ادب میں کی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ عشق ایک انسانی جذبہ ہے اور اس کی نوعیت تمامتر داخلی ہے۔ غزل کی بنیاد داخلیت پر استوار ہے اس لیے غزل اور جذبۂ عشق کے درمیان ایک ہم آہنگی اور یگانگت ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ صنفِ غزل کی بنیاد ہی اسی جذبۂ عشق کی ترجمانی کے ہاتھوں پڑی ہے بعضوں کا خیال ہے کہ فارسی میں رودکی نے سب سے پہلے غزل کی صنف کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس سے پہلے قصیدے کا رواج تھا۔ عشقیہ مضامین قصیدوں کی تشبیب میں پیش کیے جاتے تھے۔ رودکی نے قصیدے کی تشبیب کو الگ کر کے صنفِ غزل کی داغ بیل ڈالی۔ یہ بات تاریخی طور پر چاہے صحیح ہو یا نہ ہو، اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ رودکی کو جذبۂ عشق کی ترجمانی کے لیے ایک نئی صنفِ سخن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کا احساس عربی کے قصیدہ نگاروں سے مختلف تھا۔ اس لیے اس نئے احساس نے اس کو غزل کی صنف کا ہیولا تیار کرنے کے لیے مجبور کیا۔ گویا خیال کی ایک مخصوص کیفیت اور اس کا ایک مخصوص زاویہ اور جذبے کا ایک مخصوص آہنگ اس صنف کی تخلیق و تشکیل کا باعث بنا اور دیکھتے دیکھتے ایران میں اس نے وہ ترقی کی کہ جس کی مثال دنیا بھر میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ غزل کے بے شمار شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے جذبۂ عشق کے مختلف پہلوؤں کو مصورانہ شان کے ساتھ کچھ اس طرح پیش کیا کہ یہ صنف ایک اچھا خاصہ نگار خانہ بن گئی۔ فارسی ہی کے اثر سے وہ اُردو میں آئی، اور اپنے ساتھ وہ تمام روایات لائی جو ایران میں موجود تھیں۔ لیکن مقامی اثرات بھی اس پہ کچھ کم نہیں ہوئے۔

خیر تو اس طرح غزل جذبۂ عشق کی ترجمانی سے اور جذبۂ عشق کی ترجمانی غزل سے دوچار ہوئی۔

لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس طرح اس میں صرف عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنے کا ماحول پیدا ہوا، تو صنفِ غزل کے مزاج کی جو وسعتیں ہیں، ان کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں عورتوں سے باتیں بھی خوب خوب ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہا گیا ہے، اور یہ سب کچھ بھی غزل کی صنف کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ اسی لیے اس کے مزاج میں کسی حد تک اس پہلو کو بھی دخل ہے۔ لیکن وہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے۔ اس کے مزاج میں تو وسعتیں ہیں جو اندر ہی اندر پھیل کر بیکراں ہو گئی ہیں۔ ان باتوں میں بھی اس نے خاصا تنوع پیدا کیا ہے۔ ان کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ خاصی لے دے رہی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر تو اس نے عورت کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کے باوجود عورت کا نام تک نہیں لیا ہے۔ بعضوں کو یہ شکایت ہے کہ غزل نے ایسا کیوں کیا اور یہی لوگ ہیں جو غزل میں عورت کی بجائے کسی اور جنس کی صورت بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن یہ وہی لوگ ہیں جنھیں غزل کے مزاج سے آشنا ہونے کا موقع نہیں ملا ہے۔ جو غزل کو غزل کے مزاج سے دُور رہ کر دیکھتے ہیں۔ جنھیں اس کے مزاج میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملتا، یا جو لوگ اس کے مزاج میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ یا ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اس کے مزاج میں داخل ہو نہیں سکتے۔ غزل نے جہاں بھی عورت کے بارے میں باتیں کی ہیں، وہاں اس بنیادی انسانی رشتے کا سراغ لگایا ہے۔ جو عورت اور مرد کے درمیان ازل سے موجود ہے اور جو ابد تک موجود رہے گا۔ لیکن اس رشتے کی تہذیب کا پہلو اس پر ہمیشہ چھایا رہا ہے۔ وہ غزل ہی کیا جو اس معاملے میں سطحیت اور سستے پن کو اپنے دامن میں جگہ دے۔ غزل کا مزاج معاملہ بندی تک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس میں چھچھاپن کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میر نے اسی لیے جرأت کو غزل کا معیاری شاعر تو درکنار، شاعر ہی نہیں مانا۔ آزاد نے اپنی "آبِ حیات" میں اس واقعے کو صحیح نقل کیا ہے یا غلط ہمیں اس پر بحث نہیں۔ اس سے غزل کے بارے میں ایک بڑی حقیقت کا پتہ ضرور چلتا ہے اور وہ یہ کہ میر غزل کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ اور یہ مزاج اس صنف کا اسی وقت سے تھا، جب وہ پیدا ہوئی تھی۔ گویا عورت مرد کے بنیادی انسانی رشتے کی ترجمانی میں تہذیب کا خیال اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ فارسی اور اُردو

میں اس کی کئی سو سال کی روایت اس بات کی شاہد ہے۔

اور پھر اس کی تان جذبۂ عشق کی ترجمانی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ اس میں عورت اور اس کے حسن سے زیادہ مرد اور اس کے عشق کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نازِ حسن کے مقابلے میں نیازِ عشق کی تفصیل زیادہ پیش کی جاتی ہے۔ غزل کا مزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جس عشق کی ترجمانی اس میں کی جاتی ہے، اس کو اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اس کے معیاروں کا بلند ہونا ضروری ہے چنانچہ غزل نے عشق کو بھی مہذب بنایا ہے۔ سستے اور اوچھے جذبات کی ترجمانی اس سلسلے میں غزل نے کبھی برداشت نہیں کی ہے۔ سطحی خیالات اس میں کبھی بھی جگہ نہیں بنا سکتے ہیں کیونکہ ان کو غزل کے مزاج سے دُور کا بھی علاقہ نہیں۔ غزل میں عشق انسان کے ایک اہم جذبے کا نام ہے۔ اس جذبے کے کچھ معیار اور اصول ہوتے ہیں۔ اس کی ایک سطح ہوتی ہے۔ ان معیاروں اور اصولوں کو وہ چھوڑ نہیں سکتا۔ اس سطح سے وہ نیچے نہیں اتر سکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا عشق بنیادی طور پر ایک داخلی جذبہ ہے۔ اسی لیے اس کی بنیاد واردات و کیفیات پر استوار ہوتی ہے۔ یہ واردات و کیفیات ہی غزل کا سرمایہ ہیں۔ ان کی نوعیت انفرادی ضرور ہوتی ہے لیکن غزل میں داخل ہو کر وہ اجتماعی اور آفاقی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح غزل کا عشق انسانی نفسیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ غزل میں اس کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ اس کے اَن گنت پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اور پھر عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ عشق کے فلسفیانہ پہلو غزل میں جگہ پاتے ہیں۔ عشق صرف بعض جذبات کا اظہار ہی نہیں رہ جاتا، بلکہ غزل کا مزاج ان جذبات میں فلسفیانہ آہنگ پیدا کر دیتا ہے اسی لیے اس جذبے کی ترجمانی میں خاصی گہرائی نظر آتی ہے۔ اور یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا عشق غزل میں جگہ جگہ ایک علامت بھی بن جاتا ہے۔ اس منزل پر باتیں تو بظاہر عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ہوتی ہیں لیکن اس کی تہ میں انسانی زندگی کی کچھ اور حقیقتیں بیان کی جاتی ہیں۔ غرض غزل کا یہ مزاج ہے کہ وہ جذبۂ عشق کی ترجمانی میں اپنے آپ کو محدود نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے اس موضوع کے ساتھ اس میں وسعت اور ہمہ گیری، تنوع اور رنگارنگی گہرائی اور گیرائی کے عناصر جگہ پاتے ہیں۔

غرض عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی نے غزل میں ایک مخصوص فضا پیدا کی ہے۔ اس فضا کو غزل کے مزاج کے ساتھ بڑی مناسبت ہے۔ ان دونوں کو الگ کر لیا جائے تو غزل کے مزاج کا کوئی تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غزل میں محبوب اور محبت کرنے والے کے راز و نیاز کا بیان ہوتا ہے، محبوب جو کچھ کرتا ہے محبت کرنے والے پر جو کچھ گزرتی ہے۔ اس کا داخلی اظہار غزل میں ہوتا ہے لیکن غزل کا عشق صرف یہیں تک محدود نہیں۔ محبت کرنے والے کی رسوائی اس میں ہوتی ہے۔ محبوب اور محبوب کے آس پاس رہنے والے اس کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں لیکن وہ جذب صادق رکھتا ہے۔ کسی طرح باز نہیں آتا۔ ناصح اس کو نصیحت کرتا ہے۔ فقیہ شہر اس کو سمجھاتا ہے لیکن وہ نہیں سمجھتا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی عالم میں وہ محبوب سے قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہاں اس کو باریابی نہیں ہوتی۔ اور بالفرض اگر وہ اس کی محفل میں باریاب ہو ہی جائے تو محبوب اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور پھر محبوب کے دوسرے چاہنے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ رقیب اس کے لیے خاصی مصیبت بن جاتا ہے۔ غرض محبت کرنے والے پر اس عشق کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ نہ جانے کیا کیا کچھ وہ سوچتا ہے۔ اس کے سوچنے کی قوت ایک داخلی اندرونی تحریک کے نتیجے میں تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نہ صرف اپنے آپ میں بلکہ گل اور بلبل میں، شمع اور پروانے میں، قیس اور لیلےٰ میں، فرہاد اور شیریں میں اسے کاروبار شوق کا یہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے غزل میں ان سب کی باتیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ رقیب، ناصح، نامہ بر، پاسباں اور پھر گل، بلبل، شمع، پروانہ، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ان سب کو ایک شدید داخلی اندرونی کیفیت کے زیر اثر عاشق کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ خارجی طور پر ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ان سب کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو غزل میں عشق کا بھی ایک مخصوص مزاج ملتا ہے۔ عشق کے اسی مزاج نے غزل کے مزاج کو پیدا کیا ہے۔ عشق سے متعلق اس میں عجیب عجیب کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کیفیات کچھ تو عاشق پر واقعی بیتتی ہیں اور کچھ شدید داخلی اندرونی تحریکات کے زیر اثر شاعر کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ غزل ان سب کی ترجمانی کرتی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار اس صورت حال کو واضح کرتے ہیں :-

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے پہلو میں یوں آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے

(ولی)

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا، کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

(سراج)

سینۂ دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

(درد)

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مُشتِ غبار لے کر صبا نے اُڑا دیا

(میر)

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

(میر)

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار
گل رُخانِ شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت

(میر)

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

(میر)

میرے تغیرِ حال پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے

یارو وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا
آنکھوں میں سو طرح کی حکایات ہو گئیں

(سودا)

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

(سودا)

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

(سودا)

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

(غالب)

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگزر یاد آیا

(غالب)

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(غالب)

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

(غالب)

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

(غالب)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں اس کی نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

(مومن)

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

(اصغر)

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

(حسرت)

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

(فانی)

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

(جگر)

غرض غزل میں، اس طرح کاروبارِ شوق کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے اور اس کا اثر اس

حد تک بڑھتا ہے کہ عشق غزل کے مزاج میں داخل ہو جاتا ہے اور عشقیہ فضا اس کے گلے کا ہار ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل میں عشق و محبت کے علاوہ زندگی کے دوسرے موضوعات کی ترجمانی بھی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں عشقیہ رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے بظاہر تو غزل کے شعر میں عشق کی کسی معمولی کیفیت کی ترجمانی نظر آتی ہے لیکن غزل کے مزاج سے واقفیت رکھنے والے کو اس میں حیات و کائنات کے کسی اہم نکتے کا پتہ چلتا ہے اس کی نظر اس اہم نکتے کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ غزل کا مزاج یہ ہے کہ وہ ان نکتوں کو کھلم کھلا واضح نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کے دامن میں چھپے رہتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ غزل کی سینکڑوں سال کی روایت میں عشق سے کہیں زیادہ حیات و کائنات کے مختلف مسائل کی ترجمانی کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری "غزل کے بیشتر اشعار اب تک حسن و عشق کی روداد اور اس کے متعلقات پر مشتمل رہے ہیں اور خالص غزل کو عشقیہ شاعری کا مترادف سمجھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ لیکن مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی غزل سختی کے ساتھ موضوع کی اس وحدانیت کو قائم نہیں رکھ سکتی ہے۔ غزل گو شعرا شروع ہی سے زندگی کے مختلف امور و مسائل کو اشعار میں قلمبند کرتے رہے ہیں۔ مذہب اور تصوف کے رموز و اسرار، مابعد الطبیعیات کے حقائق و معارف نفسیاتِ انسانی کے نکات و اشارات، معاشرت، تمدن اور اخلاق کے اصول و معاملات، کونسا موضوع ہے جس پر غزلیات میں اشعار نہ ہوں؟" اور یہ بات صحیح ہے۔ غزل کا مزاج عشقیہ ہے اس کی فضا میں محبت کی نغمگی اور اس کے ماحول میں کاروبارِ شوق کی عنایت ہے لیکن یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے اس کے علاوہ اس کے نہ جانے کتنے پہلو ایسے ہیں جو زندگی اور کائنات کے مختلف معاملات و مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خالص عشقیہ شاعری غزل کا بہت بڑا سرمایہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا سرمایہ وہ ہے جو عشق کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ غزل اپنے حدود میں رہ کر ان سب کو اپنے دامن میں سموتی ہے لیکن یہ موضوعات غزل کے مزاج کے ساتھ اسی وقت ہم آہنگ ہو سکتے ہیں اور اس کا جزو بن سکتے ہیں جب وہ غزل کے مخصوص رنگ و آہنگ سے مل جل جائیں اور یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب ان کا اظہار غزل کے عام انداز میں ہو۔

غزل کی روایت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس نے عشق سے کہیں زیادہ ان موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ ان کو عشق کی زبان میں پیش کیا ہے۔ بادی النظر میں ایسے اشعار بھی عشقیہ ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل میں جو موضوع بھی پیش کیا جاتا ہے اس کی نوعیت ایک اندرونی داخلی تجربے کی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق وجدان سے ہوتا ہے۔ اس کی دنیا جذبات کی دنیا ہوتی ہے عقل و منطق سے اس کو دُور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے حیات و کائنات کے مختلف مسائل کی ترجمانی جب تک غزل میں جذباتی اور وجدانی زاویۂ نظر سے نہیں ہوتی اس وقت تک ان موضوعات کو غزل کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں غزل کا ماحول اجنبی سا معلوم ہوتا ہے اور غزل خود ان موضوعات کو اجنبی محسوس کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید حالی کا یہ شعر:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ   مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

شاید ایک اچھا شعر سمجھا جاتا۔ کیونکہ بہرحال یہ حالی کی غزل ہی کا ایک شعر ہے اور اس میں ایک اخلاقی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ بے شک حالی غزل کے ایک اچھے شاعر تھے۔ اس شعر میں انھوں نے ایک اہم اخلاقی مسئلے کو پیش ضرور کیا ہے لیکن اس شعر کو غزل کے مزاج کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ اس لیے اس کو غزل کا شعر نہیں کہا جا سکتا۔

غزل کے شعر تو یہ ہیں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

(میر)

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا   مری آہ نے برچھیاں ماریاں

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر   منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

گل کی جفا و فا بھی نہ دیکھی دفائے بلبل   یک مُشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن جب چشم کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

(سودا)

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(غالب)

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

(غالب)

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

(غالب)

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

(مومن)

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

(مومن)

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

(حالی)

ان اشعار کا موضوع عشق نہیں ہے لیکن غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ یہ دل پر اثر کرتے ہیں۔ ذہنوں پر منڈلاتے ہیں اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں۔ ان میں زندگی کی بے ثباتی، انسانی عظمت لیکن اس کے باوجود اس کی بے بسی ناآسودگی، بے عملی اور بے عملی سے پیدا ہونے والے نتائج کا تذکرہ ہے لیکن یہ سب کچھ غزل کے سانچے میں ڈھلا ڈھلایا ہے اور اس لیے ان میں سے تاثر کا وہ سحر ہے جو غزل کی جان ہے۔

غزل کو ان موضوعات سے اس طرح آشنا کرنے میں تصوف کی روایت نے بڑا کام کیا ہے اور شبلی کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ غزل کی ترقی کا دور درحقیقت تصوف کا دور ہے تصوف

کے توسط سے حیات و کائنات کے بہت سے موضوعات غزل میں داخل ہوتے ہیں تصوف کا تعلق داخلیت سے ہے۔ اس کی بنیاد وجدانی ہے۔ اسی لیے جو موضوعات تصوف کے راستے سے غزل میں داخل ہوئے ہیں ان کی آفاقی نوعیت بھی داخلی وجدان ہے اور اس روایت نے غزل کے دائرے کو وسیع بھی کیا ہے۔ یہاں تک کہ سماجی اور عمرانی معاملات بھی غزل کے مزاج میں داخل ہو گئے ہیں۔ اردو غزل میں تو اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اپنے اپنے زمانے کے سماجی اور عمرانی مسائل کے جذباتی ردِ عمل کو تقریباً ہر شاعر نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ غالب کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔ کیسے کیسے عجیب شعر انھوں نے کہے ہیں۔ صرف دو شعر دیکھیے:

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق — میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ان اشعار میں بظاہر تو ایک انفرادی آہنگ ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ اشعار ان سماجی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس ذہنی کیفیت کے ترجمان ہیں جن سے افراد اس زمانے میں دوچار تھے۔ شامِ فراق درحقیقت مغلیہ دور کے انحطاط کی شام پر جوئے خون کا آنکھوں سے بہنا اس تہذیب کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت موت کے عالم میں تھی لیکن شاعر ان کو دو فروزاں شمعیں سمجھتا ہے، کیونکہ مستقبل سے وہ مایوس نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں اور اسی لیے وہ لذتِ خواب کہہ کے بیدار ہونے کا پیام دیتا ہے۔ بہرحال غزل اپنے دامن میں بڑی وسعتیں رکھتی ہے۔ اس میں بڑی انسانیت ہے۔ وہ حالات کی بہت اچھی نباض ہے۔ ماحول کو وہ خوب سمجھتی ہے غیر انسانی قدروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا مزاج تو انسانی دوستی کا مزاج ہے اسی لیے اس میں سادگی ہے۔ درویشی ہے، قلندری ہے۔ زندگی کے ان پہلوؤں سے متعلق جو باتیں ہیں ان سب کی ترجمانی اس کے مزاج میں داخل ہے۔ اسی سے وہ پہچانی جاتی ہے۔

غزل ایک تہذیب کی زبان ہے، اور اس کا مزاج ایک تہذیب کا مزاج ہے۔ اس کا

جمالیاتی اظہار بھی اسی تہذیب کے مزاج کا تابع ہے۔ یہ تہذیب سیدھی اور سپاٹ نہیں پہلودار ہے۔ اس میں سادگی بھی ہے پرکاری بھی، سلاست بھی ہے رنگینی بھی۔ اور ان سب کے اثرات بھی غزل کی صنف میں ملتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مزاج کا خمیر درحقیقت اسی تہذیب سے اٹھا ہے۔ غزل ہیرے کی طرح ترشی ہوئی صنفِ سخن ہے وہ آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے۔ دلوں کو لبھا سکتی ہے۔ خود اس پہ چھا سکتی ہے، رُوح پہ منڈلا سکتی ہے۔ اس میں اجمال و اختصار ہے، رمزیت اور ایمائیت ہے۔ وہ بہت کم کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ سکتی ہے۔ اس کے اشارے بڑے ہی بلیغ اور اس کی علامتیں بڑی ہی معنی خیز ہیں۔ اس کی زبان میں بڑی ہی ساحرانہ کیفیت ہے۔ ایک ایک لفظ سے وہ جادو کر سکتی ہے۔ الفاظ کے دروبست سے پھول کھلانا اور ترکیبوں کی تراش خراش سے گل کاریاں کرنا اسے خوب آتا ہے۔ اس کے آہنگ میں نغمگی ہے۔ اس کے ایک ایک انداز میں غنائی کیفیت کا پیدا ہونا معمولی سی بات ہے۔ بظاہر اس کے مختلف اجزا میں انتشار نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اندر وہ ایک ہم آہنگی رکھتی ہے۔ اس کی بذاتِ خود بھی ایک وحدت ہے اور اس کے مختلف اجزا بھی اپنی اپنی ہیئت رکھتے ہیں۔ گویا اس کی ہیئت مختلف ہستیوں سے مل کر بنتی ہے۔ لیکن اس ہیئت میں بھی وہ ایک انفرادیت پیدا کر دیتی ہے اور یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ وہ ایک تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ ایک معاشرے کے جلوے اس میں نظر آتے ہیں۔ وہ ایک مخصوص ماحول کی ترجمان ہے اور ایک مخصوص فضا کی عکاسی کرتی ہے۔ اس پہ بدلتے ہوئے حالات کا اثر تو ہوتا رہا ہے لیکن وہ بڑی ہی وضع دار صنف ہے۔ اس لیے کسی حال میں بھی اپنی روایات سے چشم پوشی نہیں کرتی۔ اپنی بنیادی خصوصیات سے اس کو منہ موڑنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ اسی لیے اس میں بظاہر ایک یکرنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر دور میں اس کے شاعر کم و بیش ایک ہی سی باتیں کرتے نظر آتے ہیں اور بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس میں انفرادی شخصیت کا اظہار نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ شخصیت کی نفی کر رہی ہے۔ یہ بات صحیح تو نہیں ہے کیونکہ شخصیت تو بہرحال غزل میں نمایاں ہوتی ہے لیکن وہ اس زمانے کے مخصوص ماحول کی بنیادی خصوصیات اور سلسلہ بسلسلہ منتقل ہوتی ہوئی روایات سے اس حد تک متاثر ہوتی ہے کہ اس میں شخصیت کا ابھار نظر نہیں آتا۔ الیٹ نے شاعری کے

بارے میں جو یہ بات کہی ہے کہ شاعری شخصیت کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی نفی کرتی ہے۔ اس کا اطلاق سب سے زیادہ غزل کی صنف پر ہوتا ہے۔ الیٹ کے اس خیال کی تہ میں جو بنیادی بات ہے وہ غزل پر صادق آتی ہے۔ تہذیبی روایات، معاشرتی حالات اور عصری میلانات اس پر اس حد تک غالب رہتے ہیں کہ اس کے فن کار کی انفرادی شخصیت بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتی ہے۔ اس لیے بعضوں کو غزل کے مزاج میں یک رنگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ ہر دور کی غزلیں انھیں ایک سی نظر آتی ہیں مختلف شعرا کی غزلوں میں انھیں کسی امتیازی خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ وہی لوگ ہیں جو غزل کی صنف کے مختلف پہلوؤں کو اس تہذیب سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، جس نے غزل کو پیدا کیا ہے اور جس کے سائے میں اس کی نشو و نما ہوئی ہے۔ اس تہذیب میں داخلیت اور دروں بینی کی طرف رجحان عام ہے۔ اس تہذیب میں اظہار، اخفا اور اجمال کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ باتیں اشاروں اور کنایوں میں ہوتی ہیں۔ خوش مذاقی اس کی جان اور سلیقہ شعاری اس کا ایمان ہے۔ اس میں ایک نغمگی اور غنائی کیفیت ہے کیونکہ وہ خود ایک نغمہ ہے۔ لب و لہجے کی نرمی اور زبان و بیان کی شیرینی اس کے مزاج میں داخل ہے غزل کی صنف میں بھی اس تہذیب کی یہی تمام خصوصیات اپنی تمام تابانیوں اور ضوفشانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اس تہذیب نے غزل کو اور غزل نے اس تہذیب کو سہارا دے کر باقی رکھا ہے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب غزل سے اور غزل ہماری تہذیب سے پہچانی جاتی ہے۔

اُردو شاعری میں غزل کی صنف کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور یہ مزاج اس تہذیب کے مزاج کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے جس سے ہماری زندگی عبارت ہے۔ اسی لیے اس میں اس موج زندگی کا احساس ہوتا ہے جو بقول اصغر بتوں میں حسن اور شراب میں مستی ہے:

جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں ‏‏‏ ‏ اصغر غزل میں چاہیے وہ موج زندگی